تھے اور ان میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ شام کے دھندلکے میں اس نے ٹیلے کے دامن میں پھیلے ہوئے سیاہ پیڑوں کے باغ دیکھے اور اس سے نیچے وادی میں لہلہاتی فصلوں کے کھیت اور دور سے بہتے ہوئے پانی کا شور سنا اور وہ دم بخود کھڑا رہا۔ اس نے آگے بڑھنے کی خواہش محسوس نہ کی۔ چاروں طرف پھیلتی ہوئی رات میں وہ اکیلا ٹیلے پر کھڑا دیکھتا رہا۔ سفیدی مائل آسمان کے مقابل ٹیلے کی چوٹی پر اس کی سیاہ لمبی شبیہ ایک برق زدہ درخت کی طرح ساکت دکھائی دے رہی تھی۔ اسے وہ گاؤں بے حد مانوس اور خوشگوار معلوم ہوا۔ اس نے یاد کرنا چاہا' لیکن اسی دم اس کے دل میں خطرے کا احساس پیدا ہوا۔ وہ ایسے دیس میں تھا جہاں آسمان کے مقابل سیاہ شبیہوں کو دیکھ کر گولی مار دی جاتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اترنے لگے۔

راستہ پتھروں سے اٹا ہوا اور ڈھلوان تھا۔ وہ پتھروں پر سے پھسلتا پھلانگتا اور دل میں گاؤں والوں کو کوستا ہوا اترتا رہا۔ وادی کو پار کر کے سیاہ باغوں میں سے گزرتے ہوئے نمدار ہرے پتوں کی خوشبو اس کی ناک میں داخل ہوئی اور اسے گھنے جنگلوں کی مخصوص خنکی اور سناٹے کا احساس ہوا۔ بہتے ہوئے پانی کا مسلسل شور اس کے کانوں میں آ رہا تھا لیکن پانی رستے میں کہیں بھی نہ ملا' حالانکہ اس سناٹے اور سکوت کے وقت بہتے ہوئے پانی کے کنارے کھڑا ہونا اور اسے پار کرنا اس کے جی کو اچھا لگتا۔

گاؤں میں داخل ہو کر اسے اکا دکا آدمی گلیاں اور رستے پار کرتے ہوئے ملے۔ تقریباً سبھی نے بڑی بڑی گھیر دار شلو [illegible] گھومتا ہوا آخر وہ گاؤں کے مغربی کونے میں ان مکانوں کے آگے جا کھڑا ہوا جہاں سے نارنجی روشنی کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور اندر باہر شادی کا ہنگامہ تھا۔ یہی امیر خان کا مکان تھا۔ رنگ برنگے بھڑکیلے لباس پہنے اونچی آوازوں میں باتیں کرتے ہوئے مرد اور عورتیں اندر باہر آ جا رہے تھے۔ مکان کا احاطہ جلتی ہوئی چکنی لکڑی کی مشعلوں سے روشن تھا اور لکڑی میں سے تیل نکل نکل کر زمین پر ٹپک رہا تھا۔ جگہ جگہ دار چینی اور لونگ کی انگیٹھیاں سلگ رہی تھیں اور ان کا خوشبودار دھواں مشعلوں کے دھوئیں سے مل کر ساری فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ احاطے کے وسط میں بہت سے لوگ جمع تھے اور ان کے درمیان ایک دبلا پتلا بڈھا کان پر ہاتھ رکھے اونچی کرخت آواز میں گا رہا تھا۔ اتنی ساری خوشی اور ہنگامہ دیکھ کر نعیم سہم گیا۔

''میں غلط وقت پر آیا ہوں۔'' اس نے سوچا۔ ''میں اس کی خوشی میں مخل ہوں گا۔'' وہ وہیں پر کھڑا رہا۔ وہ احاطے میں سے گزر آیا تھا اور کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ اب وہ گھر کے اندر جانے والے دروازے کے پاس اندھیرے میں اکیلا کھڑا تھا۔ آنے جانے والے اس کی طرف توجہ دیے بغیر گزر رہے تھے۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا گانے والے کی آواز کو سنتا رہا۔ گیت کے بول ناقابل فہم زبان میں تھے لیکن اس کی لے میں وہی مستی اور ترنگ تھی جو اس کے اپنے گاؤں میں میلوں اور شادیوں کے موقعوں پر گونجا کرتی تھی۔

پھر گانے والے کے گرد گھیرے میں لہر پیدا ہوئی اور امیر خان ایک بیساکھی کی مدد سے چلتا ہوا نمودار

UrduPhoto.com

ہوا۔ وہ منہ میں تیز تیز باتیں کرتا ہوا اندر کی جانب آ رہا تھا۔ مشعل کے نیچے آ کر رکا' چاروں طرف چھلکتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر چل پڑا۔ وہ اسی طرح صحت مند تھا جیسے برسوں پہلے نعیم نے اسے دیکھا تھا۔ آگ کی روشنی میں اس کا چہرہ نارنجی اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ صرف اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ اس نے سرخ ریشم کا لمبا کرتا اور سرخ پھولوں والی واسکٹ پہن رکھی تھی اور سر پر تیز نارنجی رنگ کا صافہ باندھا ہوا تھا۔ اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر نعیم آہستہ آہستہ چلتا ہوا روشنی میں آ کھڑا ہوا۔

''ایں؟'' امیر خان آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے بڑبڑایا' ''بولو، تم بالکل اس کی طرح چلتے ہو۔'' پھر بیساکھی پر مینڈک کی طرح پھدک کر اس نے دو چھوٹی چھوٹی چھلانگیں بھریں حتیٰ کہ اس کی چھاتی نعیم کی چھاتی سے آ لگی۔ قریب سے دیکھ کر امیر خان نے اسے پہچان لیا اور اس کا چہرہ ایک سادہ بے اختیار مسکراہٹ میں پھیل گیا۔ اس نے اچک کر نعیم کے گال میں چٹکی بھری۔ ''ابا نعیم۔ میں اندھا ہو رہا ہوں مگر تمہیں دس ہزار انسانوں اور مویشیوں کے ہجوم میں پہچان سکتا ہوں۔''

''پہچان لیا؟'' نعیم نے اپنا مضبوط بازو اس کے گرد لے جاتے ہوئے کہا۔

''اخاہ۔ ہم کڑے وقتوں کے ساتھی ہیں۔ میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ ہم برے وقتوں کے دوست ہیں۔''

وہ اسے دبا دبا کر ٹٹولنے کے بعد کھینچتا ہوا گانے والے کے پنڈال کی طرف لے جا رہا تھا۔ رستے میں اس نے اس کے تخت چوبی [illegible] اور اسی طرح بے اختیار ہنس پڑا۔

''اچھا ہے، بہت اچھا ہے۔'' اس نے تعریفی انداز میں سر ہلا کر کہا۔

مجمع میں داخل ہوتے وقت اس نے مڑ کر اطلاع دی: ''میرے بیٹے کی شادی ہے۔''

''مبارک ہو۔'' نعیم نے کہا۔ وہ دونوں لوگوں کے سروں کو پھلانگتے ہوئے دائرے کے وسط میں جا کھڑے ہوئے۔

''اب او بڈھے مینڈک' اب ٹرانا بند کر۔'' امیر خان نے گانے والے سے کہا۔ پھر پنڈال کی طرف مخاطب ہوا: ''ہم برے وقتوں کے دوست ہیں۔ صوبے دار نعیم خان۔ یہ بہادر آدمی ہے اور میرے بیٹے کی شادی میں مہمان ہوا ہے۔''

تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور نو وارد سے جھک جھک کر ہاتھ ملانے کے بعد اس کے لیے راستہ چھوڑنے لگے۔ بڈھا اور اس کا مہمان سب سے اونچی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔ نعیم پختگی عمر کے باوجود لال ہو رہا تھا۔ امیر خان کرخت آواز میں سننے والوں سے اپنی اور اس کی پہلی ملاقات کا قصہ بیان کر رہا تھا۔

گانے والے نے پھر گانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک دفعہ اس نے نعیم کے سامنے آ کر گانے کی سعی کی لیکن امیر خان نے اس کے سر میں بیساکھی مار کر اسے بھگا دیا۔ پھر اس نے بیساکھی پاس بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کی

پسلیوں میں چبھوئی۔

''یہ میرا بیٹا ہے، وزیر خان۔''

نوجوان اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا نوعمر لڑکا تھا اور باپ کی نسبت زیادہ خوبصورت تھا۔ وہ دولہوں کے رنگین لباس میں تھا اور ہاتھ میں بہت سے پھولوں کے ہار لٹکائے ہوئے تھا۔ وہ اکھڑپن سے کھڑا اپنی بیباک آنکھیں نعیم کی آنکھوں میں ڈالے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر نوعمری اور کنوارپنے کی دمک تھی۔ نعیم نے اسے رشک سے دیکھا' جیسے ایک ادھیڑ عمر کا انسان اپنی گزری ہوئی خوبصورت جوانی کی جھلک ہر نوجوان میں دیکھتا ہے۔

''کیا کام کرتا ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''فوج میں ہے۔''

''خوبصورت جوان ہے۔''

''ہاں ہاں۔'' امیر خان ہنسا۔ ''اس نے ابھی جنگ نہیں دیکھی۔'' ''ابھی اس کے گالوں پر خون ہے۔ تمہیں کر اس ملا تھا؟''

نعیم خاموش رہا۔

''تم [illegible] دیکھا؟''

''نہیں۔'' نعیم نے جھوٹ بولا۔

''آہ۔ ہا۔'' امیر خان نے تاسف سے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ''بہادروں کی کوئی قدر نہیں، کوئی قدر نہیں۔''

''تم اپنے بیٹے کی شادی کہاں کر رہے ہو؟''

''ساتھ والے گاؤں میں۔ اپنی ہی برادری ہے۔ ابھی اس میدان میں مقابلہ ہوگا۔'' اس نے مغربی سمت میں اشارہ کر کے بتایا۔

''مقابلہ؟''

''ہاں۔''

کچھ دیر تک وہ وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر امیر خان اٹھ کر اندر چلا گیا۔ نعیم کو میزبانوں نے جو تمباکو پلایا سخت کڑوا تھا اور اس نے اس کا حلق پکڑ لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بارات روانہ ہوئی۔ آگے آگے مشعلوں کا جلوس تھا۔ اس کے پیچھے دولہا گھوڑے کی باگ تھامے پیدل چل رہا تھا۔ پھر خاموش باراتیوں کا ہجوم۔ ان کے چہرے تنے ہوئے تھے اور ان کے کندھوں پر رائفلیں خاموش تھیں۔ صرف ایک اکیلے ڈھول کی دھما دھم خاموش رات میں گونج رہی تھی۔ سب سے آخر میں امیر خان نعیم کا بازو تھامے بیساکھی پر اچھلتا ہوا چل رہا تھا اور آہستہ آہستہ باتیں کرتا جا رہا تھا: ''مقابلے سے پہلے ہم کوئی

فائر نہیں کر سکتے۔ نہ باجے بجا سکتے ہیں۔ مقابلے سے پہلے دولہا گھوڑے پر سوار بھی نہیں ہو سکتا۔ اللہ رحم کرے۔ اللہ رحم کرے۔"

تنگ پتھریلے راستوں پر جکر لگاتے ہوئے جب وہ گاؤں کی مغربی سمت میں نکلے تو یکایک ان کے سامنے ایک وسیع میدان آ گیا جو اسی طرح کی مشعلوں سے روشن ہو رہا تھا اور بہت سے لوگ خاموشی سے چل پھر رہے تھے۔ ایک بہت بڑی مشعل کے نیچے ایک چھوٹا سا خیمہ نصب تھا۔ اس سے پرے ایک قطار میں آگ کے الاؤ جل رہے تھے جن پر مسلم دنبے گھمائے جا رہے تھے۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سارے میدان میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کی چربی پگھل پگھل کر آگ میں گر رہی تھی اور چر چرا کر جل رہی تھی۔ میدان کے وسط میں ایک اکلوتا ڈھولچی اسی لئے پر ڈھول بجا رہا تھا۔

باراتیوں کو نمودار ہوتے دیکھ کر ان کی حرکت رک گئی اور سب لوگ خیمے کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ دونوں ڈھولچی ایک دوسرے کو مقابل پا کر جوش میں آ گئے اور ان کے ہاتھ مشین کی طرح چلنے لگے۔ میدان کے تین طرف پہاڑیاں تھیں اور آسمان تاریکی تھا۔ فضا میں کوئی انسانی آواز نہ تھی۔ صرف ڈھول کی دبنگ اور گرما دینے والی آواز پُرسکوت میدان میں گونج رہی تھی اور ہر دم تیز ہوتی جا رہی تھی۔ چند لمحے کے لیے نعیم کو محسوس ہوا کہ یہ کنائی کے ڈھول کی آواز تھی اور خاموشی سے کام کرتے ہوئے کسانوں کو اُکسا رہی تھی۔ کڑے وقتوں میں ڈھول کی آواز کس قدر بے رحم اور پاگل کر دینے والی ہوتی ہے اس نے سوچا۔

UrduPhoto.com

بارات میدان کے اس کنارے پر رک گئے۔ امیر خان اس کا بازو چھوڑ کر آگے بڑھا اور اچھل کر چلتا ہوا میدان کے وسط میں جا کھڑا ہوا۔ سامنے سے اس کا ہم عمر ایک بھاری جسم والا بڈھا نکلا اور آ کر اس سے ملا۔ چند لمحے ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے بعد دونوں اپنی اپنی جگہ پر لوٹ آئے۔ اب دونوں مجمعے خاموشی سے آمنے سامنے کھڑے تھے اور مشعلوں کی روشنی ان کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ پھر خیمے کا پردہ ہلا اور گول چہرے اور میانے قد کی ایک لڑکی سیاہ ریشم کا بھاری لباس پہنے، سر پر تیز سرخ رنگ کا رومال باندھے نکلی اور آ کر مشعل کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ سیاہ لباس اور سرخ رومال میں اس کی بے حد سفید رنگت چمک رہی تھی اور اس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ امیر خان کے قریب سے اس کا بیٹا باراتیوں کے مجمعے سے الگ ہوا اور بجتے ہوئے قدموں سے جا کر لڑکی سے تین قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ نوجوان دولہا کو سامنے پا کر لڑکی نے جلد جلد چند بار اپنی سیاہ آنکھیں جھپکیں، پھر نظریں جھکا لیں۔ ایک بہت لمبے قد کا پٹھان چار ماہ کے پلے ہوئے گائے کے بچھڑے کو اٹھائے ہوئے لایا اور اسے لڑکی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ لڑکی خاموشی کھڑی بچھڑے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر بچھڑے کی پشت پر رکھا اور رکھے رہی۔ اس کا چہرہ رنگ بدل رہا تھا۔ دفعتاً اس نے جھک کر چاروں طرف دیکھا اور جھک کر بچھڑے کی کمر کے گرد بازو ڈالے۔ بچھڑے کا پیٹ اس کے بازوؤں کے حلقے سے باہر تھا۔ پھر اس نے اس کی ٹانگوں کے گرد بازو ڈال کر اسے اٹھانا چاہا لیکن چار ماہ کا چوپایہ اس کے لیے بہت بوجھل ثابت ہوا۔ وہ سیدھی کھڑی ہو گئی اور دوبارہ

جھجک کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی دہشت تھی۔ ڈھول کی دھمک تیز تر ہو گئی۔ لڑکی نے ایک گھٹنا زمین پر ٹیکا اور سر بھوڑا کر بچھڑے کے پیچھے سے دوسری طرف نکالا' اس طرح کہ بچھڑے کا پیٹ اس کی گردن کی پشت پر آ گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے چوپائے کی اگلی اور پچھلی ٹانگیں پکڑیں اور اسے گردن اور شانوں پر لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں داب رکھا تھا اور اس کا چہرہ بیر بہوٹی ہو رہا تھا۔ اس کے لباس میں ہلکی سی لرزش تھی۔

ایک غیر متزلزل ارادے کے ساتھ نوجوان نے رائفل پشت پر سے اتاری اور بچھڑے کے سر پر نظریں جمائے آہستہ آہستہ اسے کندھے تک لے گیا۔ کئی لمحے تک وہ شست باندھے کھڑا رہا۔ نعیم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ شست باندھے ہوئے وہ ایک پتھر کا مجسمہ نظر آ رہا تھا جس میں ذرا بھی جنبش نہ تھی۔ لیکن اس نے لبلبی کو نہ چھوا۔ میدان میں موجود ہر شخص کے اعصاب کھنچے ہوئے تھے اور فضا میں کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ ڈھول کی تال انتہائی تیزی کو جا پہنچی تھی۔ اچانک اس نے رائفل نیچی کی' اس کا دستہ زمین پر ٹکایا اور انگلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا۔ امیر خان کے منہ سے ایک گالی نکلی اور اس نے انتہائی غیظ کی حالت میں بیساکھی زمین پر ماری۔ نوجوان نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی اور غصہ تھا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا' رائفل اٹھا کر شست باندھی اور گولی چلا دی۔ فائر کی خشک' چٹاخے دار آواز دور تک پہاڑیوں میں گونجتی چلی گئی۔ بچھڑا لڑکی کے شانوں پر تڑپ رہا تھا اور وہ انتہائی کوشش کے سا[illegible]سے پاؤں تک اس کے سارے لباس کی لرزش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی طرح کپکپاتی ہوئی ٹانگوں پر اس نے چلنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ پیر جما جما کر' مرتے ہوئے' جدوجہد کرتے ہوئے چوپائے کو جکڑے ہوئے' اٹھائے ہوئے دولھا کے راستے تک پہنچتے پہنچتے وہ تھک کر رک گئی۔ اس کے چہرے سے سرخی غائب ہونے لگی۔ لیکن جلد ہی ٹانگیں چلاتے ہوئے بچھڑے کی گردن لٹک گئی اور وہ اس کے شانوں پر بے حس ہو گیا۔ اس کے سر میں سے خون' جواب تک پتلی سی دھار کی شکل میں بہہ رہا تھا' قطرہ قطرہ کر کے ٹپکنے لگا۔ لڑکی نے پھر چلنا شروع کیا۔

دولھا کے سامنے پہنچ کر اس نے آہستہ سے بچھڑے کو زمین پر رکھا اور اس کے نیچے سے سر نکال کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ زرد اور پُرجلال تھا۔ ماتھوں پر پسینے کے قطرے لیے دونوں بے خوف نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکتے ہوئے آمنے سامنے کھڑے رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو فتح کر لیا تھا۔

مسرت کے پرجوش نعروں' رائفل کے ان گنت فائروں اور آسمان پر بارود کی چمک کے درمیان نعیم جھلا کر منہ میں بولا:

"بیچاری لڑکی۔ لاحول ولا۔"

"ہنہ' بیچاری لڑکی۔" امیر خان نے غصے سے جواب دیا۔ "اگر نشانہ خطا ہو جاتا یا ادھر اُدھر لگ جاتا تو میرے لڑکے کو وہیں پر ڈھیر کر دیتے' کافر!"

''لاحول ولاقوۃ۔'' نعیم نے دہرایا۔

نکاح کے بعد دعوت شروع ہوئی۔ آگ کے الاؤ کے گرد دونوں قبیلے زمین پر بیٹھ گئے۔ رائفل کے اکّا دُکّا فائروں اور نفیریوں کی آواز چاروں طرف پہاڑوں میں گونج رہی تھی۔ ڈھول خاموش تھا' کڑا وقت گزر چکا تھا۔ بھاری جسم والا بڈھا' جو لڑکی کا باپ تھا' تین آدمیوں کی مدد سے تھال میں بھنا ہوا مسلم دنبہ اٹھائے ہوئے لایا اور امیر خان کے سامنے رکھ دیا۔ امیر خان نے تھال میں سے چمکتی ہوئی چھری اٹھا کر نعیم کی طرف بڑھا دی۔

میرا مہمان میری طرف سے پہل کرے گا۔ اس نے کہا۔ دوسرا بڈھا خوشدلی سے ہنسا۔

نعیم نے جھجکتے ہوئے' چھری کی نوک بھنے ہوئے سرخ' چکنے دنبے پر لگائی۔ گوشت گل چکا تھا لیکن ہڈی سخت تھی۔ وہ لال ہو ہو کر اور دل میں کوس کوس کر اس کی ٹانگ کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا کہ امیر خان باتیں کرتے کرتے رک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''اررر۔ یہ۔ یہاں۔'' اس نے نعیم کا ہاتھ پکڑ کر چھری خوشبودار چانور کے پیٹ سے لگائی۔ نعیم نے ایک جھٹکے سے ٹانکے لگا ہوا پیٹ چیر دیا۔ لونگ' دار چینی اور الائچی میں پکے ہوئے چاولوں کی مقوی' اشتہا آور خوشبو کا جھونکا آیا اور بھوکے مہمانوں کے دماغوں کو تر کر گیا۔ سفید' کنواری چربی میں تر تراتے ہوئے سرخ چاول طشت میں گرنے لگے۔ امیر خان چھری پکڑ کر ماہر فن کی طرح خستہ گوشت کو ہڈیوں سے علیحدہ کرنے لگا۔ جب وہ اس سے فارغ ہوا تو سب انگلیاں چاولوں میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگے۔ امیر خان مزے لے لے کر چاول کھا رہا تھا اور اپنے نئے عزیز کو اپنی اور نعیم کی پہلی ملاقات کا قصہ سنا رہا تھا جب اس کے سر پر کرخت باؤلی ہنسی کی آواز گونجی۔

''ہاہاہا۔ ہاہاہا۔ ہاہا۔'' یہ ایک لمبے قد کا دبلا پتلا بڈھا تھا جس کی سرخ داڑھی بے تحاشا پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دنبے کی ایک ٹانگ چباتا ہوا مسلسل ہنس رہا تھا۔ کھانے اور ہنسنے کے مشترکہ فعل سے اس کی باچھوں میں رال بہہ رہی تھی اور گوشت کے ریزے اس کی داڑھی میں اٹکے ہوئے تھے۔

''اے او بڈھے۔ بڈھے دولہا کے جوان باپ' او۔'' وہ چبائی ہوئی لمبی ہڈی امیر خان کی ناک میں ٹھونس کر بولا: ''امیر خان' جو کسی دوسرے موقع پر اس کو بیساکھی کے ساتھ پیٹتا' پیچھے ہٹتا ہوا خوشدلی سے ہنسا۔ بڈھا نشے کے زیر اثر تھا۔ ''اررر ہاہاہا ہاہا۔'' جوان دولہا کے بڈھے باپ' جب تیرے لڑکے کا نکاح ہو چکا تو میں نے پوچھا: 'دنبہ کھاؤ گے؟' بولا 'نہیں' میں نے کہا۔ 'ارے او بیوقوف باپ کے بیٹے' قہوہ تو پی لے.....' ہی ہی ہی ہاہاہا۔ پھر وہ دلہن کو اُڑا کر لے گیا۔ 'اڑا کر لے گیا۔ ہاہاہا۔ لے گیا لے گیا۔''

امیر خان اور اس کا نیا رشتہ دار خوش اخلاقی سے ہنسے۔ لمبا بڈھا آسمان کی طرف منہ اٹھا کر قہقہے لگاتا اور ہڈی کو سر کے گرد گھماتا ہوا آگے نکل گیا۔ جب وہ ان کی آواز کی حد سے باہر چلا گیا تو دونوں نے اس کو برا بھلا کہا اور ناکارہ نشئی کے نام سے یاد کیا۔

کھانا ختم کر کے وہ قہوہ پینے لگے۔ قہوہ کسیلا اور خوشبودار تھا لیکن اس میں بھنے ہوئے گوشت کو ہضم کرنے

UrduPhoto.com

کی بے پناہ قوت تھی۔ الاؤ میں دیر تک جلنے والی چکنی لکڑیاں ڈالی جا رہی تھیں تاکہ شادی کی آگ تمام رات روشن رہے۔ جب قہوے کا دوسرا دور شروع ہوا تو دو نوجوان اٹھ کر الاؤ کے گرد رقص کرنے لگے۔ انہوں نے شوخ رنگوں کے لمبے گھیر دار کرتے اور شلواریں پہن رکھی تھیں اور ان کی کمروں سے کس کر پٹکے بندھے ہوئے تھے جن سے ننگی تلواریں لٹک رہی تھیں۔ وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھینک کر اور چھلانگیں لگا لگا کر رقص کر رہے تھے۔ چند چکروں کے بعد وہ سر کو ایک تیز اور مختصر جھٹکا دیتے جس سے ان کے لمبے سیاہ بال آنکھوں پر آ گرتے۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجاتے اور اسی طرح کے دوسرے جھٹکے کے ساتھ بال پیچھے پھینک دیتے۔ پھرتالی اور چکر۔ ان کے گھیر دار لباس اور بال گول دائرے میں لہرا رہے تھے۔ نفیریوں کی نازک اور سرور انگیز موسیقی کی دھن پر ان کا رقص تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ آگ کی روشنی میں ان کے چہرے دھک رہے تھے یہ قبائلیوں کا بے ہنگم ناچ تھا۔ بے پناہ جوش اور ولولے کا ناچ' جس سے ایک وحشیانہ' بے باک قوت اور جذبے کا اظہار ہوتا تھا۔

رقص کی انتہائی تیزی میں آ کر دونوں نے کمر سے تلواریں کھینچ لیں۔ چمکدار دھات آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی اور ہوا میں ان کی تیز کاٹ سے سائیں سائیں کی آواز پیدا ہونے لگی۔ فضا میں وحشیانہ تاثر بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ ننگی طاقت اور خوشی کا' بنیادی انسانی خواہش کا رقص تھا۔ انتہائی تیزی سے چاروں طرف ہوا میں بجلی کی طرح کوندتی ہوئی تلواریں گھماتے ہوئے' غیر انسانی آواز میں لمبی لمبی چیخیں مارتے ہوئے' غیض و غضب کی حالت میں ایک دوسرے کو للکارتے اور مقابلے کی دعوت دیتے ہوئے اچانک ان کی تلواریں ٹکرائیں اور وہ لڑنے لگے۔

اب یہ رقص نہ تھا' لڑائی تھی۔ دائرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آوازوں کا شور ایک دم تھم گیا۔ یہ نظارہ ان کے لیے نیا نہ تھا۔ نوجوان خون کے جوش میں اکثر' بلا وجہ طور پر' ایسا ہو جاتا تھا۔ بوڑھوں کے اشاروں پر چند ادھیڑ عمر کے مضبوط پٹھانوں نے اٹھ کر ناچنے والوں کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ اپنی پوری قوت اور فن کے ساتھ دانت پیس پیس کر ایک دوسرے پر ضرب لگانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے نشے کے شعلے نکل رہے تھے۔ گھیرے والوں نے جب موقع دیکھا تو دونوں کی کمروں میں ہاتھ ڈال کر جدا جدا کر کے لے گئے اور ان کے ہاتھوں سے تلواریں چھین لیں۔ دور تک وہ دونوں پلٹ پلٹ کر اچھل اچھل کر ایک دوسرے پر جھپٹنے کی کوشش کرتے رہے۔

پھر دونوں قبیلے گلے ملے اور تحائف تقسیم ہوئے۔ آدھی رات کے بعد دونوں قبیلے جدا ہو کر ڈھول نفیریوں اور فائروں کے شور میں اپنے اپنے گاؤں کو لوٹ گئے۔

حجرے میں پہنچ کر نعیم تھکاوٹ اور ادھ پکے گوشت کے خمار میں جلد ہی سو گیا۔ صبح میں ابھی بہت دیر تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ مکان کے اندر مدھم سی روشنی ہو رہی تھی اور انسانی آوازوں اور گھوڑوں کے ہنہنانے کا ملا جلا شور اٹھ رہا تھا۔ امیر خان کی چارپائی خالی تھی۔ نعیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ایک سایہ مکان میں سے اچھلتا ہوا برآمد ہوا۔ اندھیرے میں نعیم نے امیر خان کو پہچان لیا۔ وہ چپکے سے آ کر بستر پر لیٹ گیا۔

''کیا بات ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''وزیر خان۔ اسے یونٹ سے بلاوا آیا ہے۔'' امیر خان نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

''ابھی؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

امیر خان خاموش رہا۔ نعیم کو فوج کی ملازمت کی پرانی تکلیف دہ یاد آئی اور اس نے دل میں گالی دی۔

''چلا گیا؟''

''پتا نہیں۔ میں چھوڑ کر آ گیا ہوں۔ شادی کی رات میں اس کا جانا پسند نہیں کرتا۔'' اپنے دکھ کو چھپانے کے لیے امیر خان نے سختی سے جواب دیا۔

نعیم پر پھر خمار چھانے لگا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب پتھریلی ڈھلانوں پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز پیدا ہوئی اور دور تک چلی گئی تو اس کے دل میں جانے والے کے لیے افسوس پیدا ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں دیکھا۔ امیر خان سیدھا لیٹا بے خواب آنکھوں سے چھت کو تکے جا رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد امیر خان نے بستر پر بازو پھیلا کر پریشان آواز میں دو دفعہ پکارا۔ ''نعیم۔ نعیم۔'' وہ اندر سے ہل چکا تھا۔ نعیم پر نیند طاری تھی۔

UrduPhoto.com

بہت سفید رنگت اور براؤن بالوں والا ایک شخص جس نے ہاتھ کے کاتے ہوئے کھدر کا لباس پہن رکھا تھا' بازار کے عین وسط میں چبوترے پر کھڑا کھدر کی ایک سفید پٹی کو سر کے گرد گھما رہا تھا۔

''نمک۔ نمک۔ نمک۔'' اس کے اردگرد سے آوازیں اٹھیں۔

چبوترہ ایک سٹیج کی شکل کا تھا جو لکڑی کے کریٹوں اور بکسوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا اور ٹاٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس پر کھڑا ہوا شخص ایسے لوگوں میں سے تھا جن کی عمر کا اندازہ آسانی سے نہیں لگایا جا سکتا' پھر بھی وہ نوجوانوں میں شمار نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کا چہرہ قدرے لمبوترا اور نقش باریک تھے۔ قریب سے دیکھنے پر اس کی جلد بیشمار باریک باریک تلوں سے بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بادامی تھا۔

ایک دفعہ بولتے بولتے اس نے کھدر کی پٹی تیزی سے سر کے گرد گھمائی اور نمک کا نعرہ لگایا۔ اس کے گرد کھڑے ہزاروں کے مجمعے میں سے شور بلند ہوا۔ یہ نمک خاصیت میں روشن پور والے نمک سے بہتر اور قابل خورد تھا۔ لیکن شاید زندگی میں ایک دفعہ' اتنے اچھے' اتنے معمولی نمک کو دیکھ کر کسی کے دل میں اسے کھانے کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ وہ مقدس ہاتھوں کا تحفہ تھا۔

رنگوں کے شیدائی وہ لوگ شادی کے بھڑکیلے کپڑے پہنے سڑکوں پر اور گلیوں میں ایک ہی سمت میں رواں تھے' جدھر وہ کھدر پوش چبوترے پر کھڑا تھا۔ نوجوانوں کی آنکھیں سرمئی اور مسوڑھے کڑوے درخت کی چھال سے

عقابی ہو رہے تھے اور بوڑھوں نے داڑھیوں پر مہندی مل رکھا تھا۔ اونچی تیکھی ناک، سفید رنگت اور عقابی نظروں والے ان مردوں نے جو کڑی تربیتوں میں سے گزر کر آرہے تھے، آج آخری اعلان سن کر اپنے اپنے کاروبار بند کر دیے تھے اور اس وقت قانون شکنی کا قدیم جبلی جذبہ دلوں میں لیے راستوں پر ادھر اُدھر تھوکتے اور نسوار کی ڈبیوں کے شیشوں میں دیکھ کر داڑھیاں سنوارتے ہوئے قانون شکنی کے منظر کی طرف لوٹ رہے تھے۔

مرکز کے گرد پولیس کی بھاری تعداد تھی۔ جلسے میں جانے والے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے غرور اور نفرت سے ان کی طرف دیکھتے اور اونچی کرخت آوازوں میں قہقہے لگا رہے تھے۔ پولیس والے ان کی نظروں سے بچنے کے لیے اوپر اوپر دیکھ رہے تھے۔ جب آخری بار کھدر پوش نے پٹی کو تیزی سے گھمایا اور ایڑیوں پر چاروں طرف گھوما تو ہجوم کا دبا دبا شور دفعتاً پھٹ پڑا اور سینکڑوں رائفلیں ہوا میں اچھالی گئیں جن کی دھات نے دھوپ میں خیرہ کن چمک پیدا کی۔ یکا یک ایک دوسرا کھدر پوش نوجوان، جو غیر معمولی لمبے قد اور ڈیل ڈول کا آدمی تھا، کود کر چبوترے پر آ چڑھا۔ اس نے دونوں بازو ہوا میں پھیلائے اور چرخی کی طرح پاؤں پر گھومنے لگا۔

''ایک فائر نہیں، ایک بھی فائر۔'' وہ چلایا۔

جب وہ رکا تو اس کی آنکھوں سے ملامت ٹپک رہی تھی اور ہونٹ کچھ کہنے کے لیے بے چینی سے کانپ رہے تھے۔ وہ اسی طرح بازو پھیلائے مجمع کو دیکھتا ہوا کھڑا رہا۔ رائفلیں جہاں تھیں وہیں پر رک گئیں اور ہزاروں انسانوں کے مجمع پر سکوت چھا گیا۔ [illegible]

''[illegible] کیا مطلب ہے؟'' وہ چیخا۔ ''انہیں گھر رکھ آؤ۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟ انہیں دیکھو۔'' اس نے ہاتھ لمبا کر کے پولیس کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان سے لڑنا چاہتے ہو۔ وہ تمہارے بھائی ہیں۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟ ہیں؟ ایک بھی جان ضائع نہ ہو، ایک بھی جان''۔ انتہائی غصے میں رک رک کر بات مکمل کرنے کے بعد وہ ملامت بری نظروں سے دیکھتا ہوا چبوترے سے اتر گیا۔ کھسیائے ہوئے مجمع میں دبے غصے کی دھیمی ہموار آوازیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئیں۔

دوسرے کھدر پوش نے پٹی میں باندھی ہوئی نمک کی ڈلی کو ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

''کل شراب کی دکانوں پر پکٹنگ ہوگی۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔ مجمع آہستہ آہستہ منتشر ہونا شروع ہوا۔

اس رات پشاور شہر میں نمک بنانے والے بہت سے والنٹیروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ نعیم اس وقت امیر خان کے گاؤں میں سو رہا تھا۔ اگلی صبح جب وہ شہر آرہا تھا تو اسے پکڑ لیا گیا۔ پولیس کی سیاہ وین بازار قصہ خوانی میں کابلی تھانہ کے سامنے آکر رکی۔ تھوڑی دیر کے بعد نعیم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ حوالات میں بیٹھا تھا۔

دوپہر سے پہلے پہلے قصہ خوانی بازار شہریوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ وہ سوتے ہوئے اٹھ کر چلے آئے تھے۔ ان کی داڑھیاں بکھری ہوئی اور گرد آلود تھیں اور کپڑے میلے کچیلے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نیند اور دماغوں میں غصہ

بھرا ہوا تھا کیونکہ وہ اپنی بندوقیں پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اس وقت اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہے تھے۔ آج بھی وہ بازار کے فرش پر ادھر اُدھر تھوک رہے تھے اور ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے تھانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

تھانے کے گرد دور دور تک پولیس کا پہرہ تھا۔ وہ زیادہ تر پٹھان تھے اور پچھلے دن کی طرح آج بھی ان کے ساتھ آنکھیں ملانے سے احتراز کر رہے تھے لیکن مستعدی سے اپنی جگہوں پر کھڑے سنگینوں اور آہنی زنجیروں کی مدد سے ہجوم کو روکے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر اچھلتے کودتے اور لڑکھڑاتے ہوئے ہجوم میں سے دبی دبی غراہٹ ابھرتی جو ایک مستقل غصیلی چنگھاڑ کی آواز اختیار کر لیتی' کہیں کہیں سے اکا دُکا آوازیں آتیں۔ ''چھوڑ دو...... چھوڑ دو۔'' پھر خاموشی چھا جاتی۔ بہت آہستہ آہستہ پولیس کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ کھلے موسم کے باوجود بے شمار انسانی جسموں کی رگڑ سے دن میں گرمی پیدا ہو گئی تھی۔ سورج ابھی نصف النہار پر نہ پہنچا تھا۔

پھر بھاری مشینوں کی دھیمی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایک طرف سے چند آرمرڈ کاریں بازار میں داخل ہوئیں۔ ان کی بتیوں پر سیاہ غلاف پڑے ہوئے تھے اور ہر رنگ کا کوئی نشان باقی نہ چھوڑا گیا تھا۔ سیاہ لوہے کے وہ مہیب' اندھے جانور پوری رفتار سے ہجوم کے ساتھ ٹکرائے اور سست رفتار پٹھانوں کو کچلتے ہوئے آگے نکل گئے۔ دہشت زدہ شہری بازار چھوڑ کر گندے پانی کی نالیوں میں اور دکانوں کے تختوں کے نیچے گھسنے لگے۔ جو اس پر بھی بچ گئے وہ بند دکانوں کے تالے توڑ کر اندر چھپ گئے۔ پل کے پل میں بازار بے قابو شہریوں کے مجمع سے خالی ہو گیا۔ بکتر بند گاڑیوں [illegible] خالی [illegible] اور چند کچلے ہوئے انسانی جسم دور دور پڑے تھے۔ وہ پٹیوں پر سے' ٹانگوں پر سے اور سینوں پر سے' جہاں جہاں سے بکتر بند گاڑیوں کے پہیے گزرے تھے تقریباً تین فٹ زمین پر لیپ ہو چکے تھے اور ان کی سفید آنکھیں اور زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آناً فاناً موت ان کے چہروں پر حیرانی کا تاثر چھوڑ گئی تھی۔

''مر چکا ہے۔'' کالی پگڑی والے پٹھان نے سر نالی میں نیچا کرتے ہوئے کہا۔

وہ جسم بہت سی نگاہوں کا مرکز تھا۔ گاڑی اس کے پیٹ پر سے گزری چلی گئی تھی اور باہر پڑی ہوئی ریزہ ریزہ انتڑیوں کے ڈھیر میں سے دودھیا رنگ کا سیال بہہ رہا تھا۔ جس میں خون کی دھاریاں تھیں اور ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے جان تھا لیکن آہستہ آہستہ ہل رہا تھا اور حلق سے ایک مردہ کراہ نکل رہی تھی۔ دکان کے تختے کے نیچے نالی میں چھپے ہوئے چند پٹھان کان لگا کر اس کی آواز سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

''نہیں ہل رہا ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

''مر چکا ہے۔'' پہلا درشتی سے بولا۔ ''تم نے ذبح کیا ہوا گوشت دیکھا ہے جو پھڑکتا ہے؟''

''آواز سن رہے ہو؟''

پہلا سنی ان سنی کر کے تاسف سے سر ہلانے لگا۔ ''مر چکا ہے۔ کتے کی طرح...... کتے کی طرح۔''

''گولی مار دوں؟'' دوسرے نے کہا۔ ''میرے پاس پستول ہے۔''

پہلے نے پریشان نگاہوں سے سامنے دیکھا۔ پھر دوسرے نے دیکھا۔ کچھ دیر تک دونوں نالی میں سے آنکھیں نکالے سامنے سے گزرتے ہوئے فوجیوں کو دیکھتے رہے۔

"خود بخود مر جائے گا۔" پہلے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ خود بخود مر جائے گا۔" کچھ دیر کے بعد دوسرے نے دہرایا۔

سامنے فوجیوں کے دستے گزر رہے تھے۔ وہ مختلف جگہوں پر رک کر پوزیشن لے رہے تھے۔ پولیس والے اب پیچھے ہٹ کر تھانے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ بازار خالی تھا' لیکن ان دیکھی قوت سے پھٹ پڑ رہا تھا' جیسے منہ بند کیتلی' جس میں پانی آہستہ شور کے ساتھ ابلتا ہے۔

دفعتاً مغربی سرے پر ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ ایک بکتر بند گاڑی کا پٹرول جل اٹھا۔ پھر اس میں پڑا ہوا میگزین پھٹنے لگا۔ یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے' گاڑی کی چھت پھٹ گئی' اس میں بیٹھے ہوئے سپاہیوں کے ٹکڑے دور دور تک اڑ گئے اور بارود دھوئیں کے بادل آسمان کو اٹھنے لگے۔ بارود اور جلتے ہوئے انسانی گوشت کی بو بازار میں پھیل گئی۔

گاڑی کے پیچھے ایک پٹھان کا سر نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ باہر آنے لگا۔ اس کا چہرہ موت کی اذیت سے بگڑ چکا تھا لیکن وہ اندھا دھند زمین پر بازو چلاتا ہوا سرک رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد وہ باہر آیا۔ کمر سے نیچے اس کا دھڑ غائب ہو چکا تھا۔

"الٰہی..... ابھی تک زندہ ہے۔" کسی نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

نالیوں میں، تختوں کے نیچے اور دکانوں کے دروازوں کے پیچھے چھپے ہوئے پٹھانوں نے اس طرف سے نظریں پھیر لیں۔

UrduPhoto.com

بارود کے دھماکوں سے شہریوں میں کھلبلی مچ گئی۔ دھکم پیل میں ایک ننگے سر کا نوجوان پٹھان' جس کے بال آنکھوں پر بکھرے ہوئے تھے' باہر اچھل پڑا۔ اس نے واپس نالی میں جانا چاہا لیکن وہاں ایک چوہے کی جگہ بھی نہ تھی۔ جھکے جھکے اس نے بازار پار کیا اور تختے کے نیچے گھسنا چاہا۔ اس طرف سے ایک زوردار دھکا پڑا اور ساتھ ہی کسی نے کرخت آواز میں خدا کی قسم کھا کر گالی دی۔ وہ پلٹ آیا۔ بازار کے درمیان ایک لمبے انگریز فوجی نے دانت پیس کر پہلو سے ریوالور نوچا اور ایک فٹ کے فاصلے سے گولی چلا دی۔ گولی اس کی گردن میں لگی۔ گردن کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر وہ جھکا حتیٰ کہ اس کے گھٹنے اور ماتھا زمین پر ٹک گئے اور انگلیوں کے درمیان سے خون باہر آنے لگا۔ کئی لوگ اچھل کر پناہ گاہوں میں سے نکل پڑے۔

"فائر......" ایک آنکھ والے کیپٹن وڈ نے چیخ کر حکم دیا۔

فوجی دستے کی پہلی قطار بے حرکت کھڑی رہی۔ کانا کیپٹن ایک لمحے کو متعجب ہوا' پھر اس نے آنکھیں سکیڑیں۔ "گڑھوالی رائفلز رجمنٹ' کمپنی نمبر...... فائر...... فائر۔" وہ غصے سے لرز اٹھا۔ گڑھوالی رائفلز کا دستہ اسی

طرح کھڑا تھا۔ چند لمحے تک افسر اور ماتحت ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر قطار کے آخیر پر ایک سپاہی نے منہ کھولا۔ وہ بھاری سانولے چہرے والا شخص تھا جس نے ٹوپی آنکھوں پر کھینچ رکھی تھی۔ اس نے لب ہلائے بغیر سامنے دیکھتے ہوئے غیر جذباتی آواز میں کہا:

''وہ نہتے ہیں۔''

''میں حکم دیتا ہوں گولی چلاؤ۔'' کیپٹن وڈ پاگلوں کی طرح چیخا۔ ''فائر.....''

گڑھوالی دستے کے ہتھیار منجمد تھے۔ ان کے چہرے بے رنگ پتھر کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے ہونٹ سفید اور بھنچے ہوئے تھے اور ایک سپاہی کے دل میں نہتے' بے بس ہجوم پر حملہ کرنے سے جو تنفر ہوتا ہے ان کے چہروں پر رقم تھا۔ انگریز افسر نے اس ان لکھی عبارت کو صاف طور پر پڑھ لیا۔

انتہائی کوشش سے اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ پھر اس نے نظریں اٹھائیں اور دبی ہوئی' گہری آواز میں بولا: ''جنہوں نے حکم عدولی کی ہے باہر آجائیں۔''

قطار میں سے چودہ سپاہی ایک قدم آگے نکل آئے۔ ایک سرے پر بھاری سانولے چہرے والا سپاہی اور دوسرے پر لمبے دبلے پتلے جسم والا خوبصورت وزیر خان تھا۔

''انہیں گرفتار کرلو۔'' کیپٹن نے حکم دیا۔ پچھلے دستے نے بڑھ کر ان کے ہتھیار لے لئے اور رائفلوں کے آگے لگا کر انہیں باہر لے آئے۔ ان کے چہروں پر رنج جھلک آیا تھا اور وہ قدم ملائے بغیر لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے۔

''فائر..... فائر..... فائر۔''

پچھلے دستے آگے آگے اور گولی چلنی شروع ہوگئی۔ اندھا دھند فائرنگ میں نالیوں اور تختوں کے نیچے چھپے ہوئے شہری چوہوں کی طرح نکل کر بھاگے اور ایک ایک کرکے گرنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے بازار مرتے ہوئے' کپکپاتے ہوئے اور زمین پر ایڑیاں مارتے ہوئے انسانوں سے اٹ گیا۔

حوالات کے دروازے کی سلاخوں میں سے نعیم نے بازار کے اس حصے میں جو اسے دکھائی دے رہا تھا' بھاگتے اور گرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ جذبے کی انتہا پر پہنچ کر چند لمحے جو تعطل کے آتے ہیں ان میں اس نے سوچا:

''ان کی فصلیں تیار کھڑی ہیں۔''

(۲۸)

شانتی نگر شہر سے باہر ایک چھوٹی سی صاف ستھری بستی تھی جیسی ہر ایک مل کے ساتھ ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے الگ الگ بنے ہوئے پکی اینٹوں کے مکان جن پر چونے کی سفیدی کی گئی تھی۔ بیچ بیچ میں بغیر سفیدی کئے

ہوئے مکان بھی تھے جو بارش کے موقع پر دھل کر گہرے سرخ ہو جاتے اور تازہ پکی ہوئی مٹی کی خوشبو چھوڑنے لگتے۔ اسی موسم میں سفیدی والے مکان پر بارش کی سیاہ لکیریں پڑ جاتیں جو بدنما لگتیں اور ان پر دوبارہ سفیدی کرنی پڑتی۔

پانی کے نل مکانوں میں سے نکل کر دیواروں کے ساتھ ساتھ چلے گئے تھے اور آگے جا کر زمین میں دھنس جاتے تھے۔ دیواریں اونچی تھیں اور گلی میں گزرتا ہوا لمبے سے لمبا آدمی بھی صحن میں چلتی پھرتی عورتوں اور بچوں اور الگنی پر پھیلے ہوئے کپڑوں کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ سڑکیں چوڑی اور سیدھی تھیں اور ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر کاٹتی تھیں۔ دو ایک جگہ چوراہوں پر فوارے نصب کئے گئے تھے جن کے چاروں طرف سیمنٹ کے گہرے ٹینک بنے تھے۔ لیکن ابھی پانی نہ چلا تھا اور ان میں کوڑا کرکٹ' آموں کی گٹھلیاں' کاغذ کے پرزے' ٹوٹے پھوٹے کھلونے اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی بیکار چیزیں بھری رہتی تھیں۔ شام کے وقت بستی کے بچے ان کی سیڑھیوں پر ایک دوسرے کی قمیصیں پکڑ کر آگے پیچھے بھاگتے اور منہ سے گاڑی کے انجن کی آواز نکالتے جاتے۔ جب وہ تھک جاتے تو سب سے اوپر کی سیڑھی پر چڑھ کر بیٹھ جاتے اور چھوٹی چھوٹی بیکار چیزیں جن سے وہ تنگ آ چکے ہوتے' نیچے پھینکتے رہتے۔ کبھی کبھی کوئی لڑکا کتے کا پلا پکڑ کر لے آتا اور سب مل کر اس کی کمر میں رسی باندھ کر نیچے ٹینک میں لٹکا دیتے اور اس کی چیخوں کا مزہ لیتے۔ ان کی مائیں اور بہنیں دروازوں سے سر نکال کر دیکھتیں اور انہیں اس کام سے باز رہنے کو کہتیں۔

آس پاس دور دور تک کوئی درخت یا سایہ نہ تھا اور سلسلہ وار کوئی مدھم لکیر' جو عموماً [illegible] دکھائی دیتی ہے' ندارد تھی۔ چنانچہ [illegible] دھوپ [illegible] اور برآمدوں میں پھیل جاتی اور مرغیاں اور دوسرے پالتو پرندے دیواروں پر سے کود کود کر صحن میں پھرنے اور اپنے شکار اور مضحکہ خیز طریقے پر کیڑے مکوڑوں کے تعاقب میں دوڑنے لگتے۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرے دھوپ کے سیلاب سے بھر جاتے اور اندر رکھی ہوئی گھریلو استعمال کی چیزوں پر گرد کے ذرات چمکنے اور صاف کئے جانے کی یاد دہانی کرانے لگتے۔

گلیاں' جو عموماً صاف ستھری رہتیں پختہ تھیں اور دونوں کناروں پر ڈھکی ہوئی گندے پانی کی نالیاں بہتی تھیں۔ سڑکوں کی مانند یہ بھی سیدھی تھیں اور ایک دوسرے کو عموداً کاٹتی تھیں۔ بستی کو اگر بلندی سے دیکھا جاتا تو یوں لگتا جیسے اقلیدس کے بڑے بڑے آلوں سے سیدھی لکیروں' دائروں' چوکوروں اور تکونوں کا خاکہ بنا دیا گیا ہو۔ اس میں گاؤں کی گندگی' کھلاہٹ' بے ڈھنگا پن اور ہمہ گیری نہ تھی۔ کہیں کہیں مکانوں کے آگے سبزہ اگانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن پانی کے ناقص انتظام کی وجہ سے زیادہ تر کوششیں ناکام ثابت ہوئی تھیں۔

پھر بھی یہ بستی ہندوستان کی بہترین صنعتی بستیوں میں سے تھی اور گاہے گاہے حکومت کے ذمہ دار ارکان نچلے صنعتی طبقے کی خوشحالی کا نقشہ دیکھنے کے لئے وہاں لائے جاتے تھے۔

اس سے پرے کپڑے کی مل تھی جو ابھی نامکمل تھی اور تیزی کے ساتھ مکمل کی جا رہی تھی۔ مل کے دوسری طرف ایک اور نسبتاً مختصر بستی تھی' اس طرح کہ مل درمیان میں آ جاتی تھی اور دونوں بستیوں کے رہنے والے اپنے اپنے گھروں میں سے ایک دوسرے کے گھروں کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ صرف اس وقت جب سب لوگ مل میں کام

کرتے جاتے وہ ایک دوسرے کی بستی کو دیکھ سکتے۔

چھوٹی بستی بڑے مکانوں پر مشتمل تھی اور سبزہ اگانے کی کوششیں زیادہ منظم طور پر عمل میں لائی گئی تھیں۔ چنانچہ اکثر مکانوں کے آگے چھوٹی چھوٹی باڑیں، اکا دکا موسمی پھول، گملے اور کھردرے گھاس کے قطعے دکھائی دیتے تھے۔ مکانات جدید طرز پر بنے ہوئے تھے اور بغیر سفیدی کے تھے جس سے مکینوں کی سادگی اور عمدہ مذاق کا پتا چلتا تھا۔ چند ایک برآمدوں کے ستونوں پر بیلیں چڑھنا شروع ہو گئی تھیں۔

مل سے سیمنٹ کی پختہ سڑک شروع ہوتی تھی جس پر ہر وقت موٹر کے ٹائروں کے نشان پڑے رہتے تھے۔ جہاں پر سڑک ختم ہوتی تھی وہاں سے یہ بستی شروع ہوتی تھی۔ سب سے پہلے نصف دائرے میں بنے ہوئے پندرہ بیس کمرے آتے تھے۔ ہر ایک کمرے سے ملحقہ ایک ایک غسلخانہ تھا جس میں جدید طرز کا سامان مہیا کیا گیا تھا۔ ان کمروں کے سامنے ٹینس کھیلنے کا پختہ کورٹ تھا جس میں ہر وقت جالی لگی رہتی تھی۔ یہاں پر نوجوان، غیر شادی شدہ، تعلیم یافتہ افسر رہتے تھے۔ اگلے مکانوں میں بڑے افسروں کی رہائش تھی جو ادھیڑ عمر اور بڑے عیال دار لوگ تھے۔

ہر ایک گھر کے آگے بہت سی خالی جگہ باغ کے لئے مخصوص کی گئی تھی جس میں ایک آدھ مالی دن بھر کام کرتا رہتا تھا۔ وہ عموماً ایک چھوٹے قد کا، منحنی سا بوڑھا کسان ہوتا جو خاموشی اور اداسی کے ساتھ ربڑ کے لمبے لمبے پائپ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھتا اور گھاس کو پانی دیتا رہتا۔ جھک کر اور پاؤں پر بیٹھ کر کام کرتے رہنے کی وجہ سے اس کی [illegible] کوشش میں مصروف رہتا۔ باہر کے پھاٹک سے لے کر برآمدے تک لمبی ڈرائیو تھی جس پر بجری بچھا کر رولر سے زمین ہموار کی گئی تھی۔ گھر کے بچے اکثر کھیلتے ہوئے نظر آتے۔ وہ سفید رنگت اور سیاہ آنکھوں والے گول مٹول بچے ہوتے جو گرم موسموں میں صرف جانگیے پہنے پانی کی ٹونٹیوں کے گرد کھیلتے اور جاڑوں میں شوخ رنگ اونی بنیانیں اور پتلونیں پہنے برآمدے کے فرش پر لکڑی کے گھوڑے اور موٹریں دوڑاتے پھرتے۔ وہ نیچے والی بستی میں کبھی نہ جاتے۔

ان گھروں کے پچھواڑے عام کوٹھیوں کے پچھواڑوں کی طرح تھے۔ اونچی نیچی باڑیں، رسی پر پھیلے ہوئے چھوٹے بڑے کپڑے، گھڑونچی پر مٹی کے گھڑے اور لوہے کے گلاس اور لوٹے، مرغیاں اور ان کے ڈربے، پودینے اور ٹماٹر کی کیاریاں۔ دن کے دوران گھر کی مالکاؤں اور ماماؤں میں بہت کم امتیاز کیا جا سکتا، سوائے شام کے وقت کے جب گھر کی عورتیں لباس تبدیل کر کے مردوں کے ہمراہ سامنے والے حصے میں ٹہلتیں اور کبھی کبھار مالی سے پوچھ گچھ کر لیتیں۔

وہاں تین مختلف قسموں کے لوگ رہتے تھے۔ بڑی بستی میں ہاتھ سے کام کرنے والے کاریگر اور چھوٹے موٹے کاموں میں ان کی مدد کرنے اور کام سیکھنے والے لوگ تھے۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو در حقیقت کسان تھے اور خشک سالی و مزارعہ گیری سے تنگ آ کر شہر میں محنت کرنے کے لئے آ گئے تھے۔ ان میں سے بہت کم ایسے تھے

جن کا آبائی پیشہ لوہار یا ترکھان کا تھا۔ باقی سب زمین کے بیٹے تھے اور زندگی کے چکر میں ایک بالکل انوکھی دنیا میں آنکلے تھے اور اپنے آپ کو وہاں کا باشندہ بنانے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔

وہ محنت کش مرد تھے اور دن رات میں دو وقت کھاتے تھے۔ ان کی غذا میں زیادہ مقدار اناجوں کی ہوتی جن سے وہ کام کرنے کے لئے حرارت اور قوت حاصل کرتے۔ چنے ان کی خوراک میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے جن کو ان کی عورتیں کئی مختلف طریقوں پر پکاتیں۔ گوشت کی کمی انڈے پوری کر دیتے جو تقریباً ہر گھر میں پالتو مرغیوں اور بطخوں سے حاصل کئے جاتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا' چونکہ ہر کام کرنے کے دن ان کا بہت سا پسینہ نکل جاتا اس لئے وہ ہر دم نکھرے ستھرے رہتے۔ ان کی عورتیں اور بچے دن رات میں تین دفعہ کھاتے۔ یہ ان کی جسمانی صحت کی حالت تھی جسے قائم رکھنے کے لئے وہ پیسے کما لیتے تھے۔

لیکن زندگی جسمانی صحت کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اور اس کے لئے خوش و خرم رہنا نہایت ضروری بات ہے۔ اسی بات کے لئے وہ تگ و دو کر رہے تھے بغیر جانے بوجھے!

روح کی وہ گھبراہٹ اور تر و تازگی جو انسانی زندگی میں قوت اور سکون پیدا کرتی ہے' جو محنت کرنے والوں کو اطمینان بخشتی ہے' روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی' غیر اہم چیزیں جو خوشی دیتی ہیں' جو نہایت اہم ہیں: روز روز کے مقابلے' لڑائی جھگڑے' کبھی کبھی کے میلے' تہوار' دوست' دشمن' ہولی' دیوالی' عاشورہ' عید' بیل' شکار' گپوں میں بے کار وقت خرچ [illegible] زندگی [illegible] منڈیاں [illegible] جو موسموں کے ساتھ رنگ بدلتے اور ہوا میں جھومتے' نالیاں جن میں پانی ہلکے شور کے ساتھ بہتا' یہ سب بے زبان' جاندار چیزیں' جو کسان کی زندگی میں رچ بس کر اس کا ایک حصہ بن جاتی ہیں' پیچھے رہ گئی تھیں۔ اب سیدھے سیدھے الگ تھلگ مکان تھے جن کی اپنی حد بندی تھی واضح اور متعین عمودی لکیریں اور متوازی لکیریں جو علیحدگی کو ظاہر کرتی تھیں۔ درختوں سے محروم' بدرنگ فضا میں دھوپ چلچلاتی اور صاف ستھرے مکان اجاڑ معلوم ہوتے' جن کی اپنی اپنی چھتیں تھیں' اپنے اپنے صحن تھے' اپنی اپنی زندگیاں تھیں۔ جب وہ راستے میں ملتے تو کسانوں کے اکھڑ دوستانہ لہجے میں ایک دوسرے کا حال پوچھتے' پر دلوں کی ہمسائیگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے اپنے خول نما گھروں میں واپس آ جاتے' اپنی اپنی منفرد دنیا میں مستقل بدلتی ہوئی زندگی کی اذیت کے زیر اثر رہنے کے لئے..... گاؤں کی وہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہوئی چھتیں اور حدیں' جہاں ہر کسی کو اپنی اپنی جائداد پر فخر ہوتا تھا پر جو لاحدود تھی' جس میں لاتعلقی نہ تھی۔ ساجھے کے صحن اور ساجھے کی دیواریں' منڈیریں' جن پر ہر کوئی بیٹھ سکتا تھا اور جن کی ہر کوئی مرمت کر سکتا تھا۔ ٹیڑھے میڑھے گھر جن کا پتہ نہ چلتا تھا کہ کہاں سے شروع ہوتے تھے اور کہاں پر ختم۔ مرغی مزاج بے ترتیب گلیاں' کہیں سے چوڑی کہیں سے تنگ اور بیچ میں گندے پانی کی نالی' چلتے چلتے جس میں پاؤں پھسل کر جا پڑے اور چھینٹے اڑ کر ٹانگوں کو خراب کر دیں۔ چلتے چلتے پھر ایک گلی اچانک ختم ہو جائے اور آگے رستہ بند ہو اور وہاں ایک چھپر ہو اور ایک کنبہ..... ارے' یہ گلی ہے یا گھر؟ 'سلام علیکم ماسی' اللہ کرم کرے..... ' دلوں کی ہمسائیگی ختم ہو چکی تھی۔ اب وقت

مقررہ پر لوہے کے اوزاروں اور سیمنٹ کے مسالے اور تپے ہوئے سرخ لوہے کے ساتھ مل کر کام کرتے رہو ایک تال۔ ایک تال۔

اور وہ بیل کے ساتھ مل کر باتیں کرنے کی خوشی۔ چمکتی ہوئی سیاہ' نمدار آنکھوں والا بیل جو رفیق بھی تھا اور نوکر بھی' جو خاموشی سے ساری باتیں سنتا تھا اور ضد بھی کرتا تھا۔ گوبر کے ڈھیر اور چاندنی راتوں میں گھنٹیوں کی آواز اور جب کوئی ہمسایہ گائے لے کر آتا تو ساری دنیا کی مردانگی اور غرور دل میں لے کر بیل کو اٹھاتے اور گائے کے پاس لے جاتے۔ ملاوٹ کے بعد گائے والا شکریہ ادا کرتا اور بیل والا اپنے نر کی کامیابی پر اس کا ٹھٹھہ کرتا اور لطف لیتا۔ پھر کھیتوں میں روز بروز بڑھتی ہوئی فصل تھی جس میں نوخیز لڑکی کی رعنائی اور اٹھان ہوتی تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم چیزیں تھیں جو زندگی کا جزو تھیں اور جب زندگی کا وہ حصہ گم ہو گیا تو اس کی تلاش ایک گھلا دینے والی' بیمار کر دینے والی بے کلی بن کر ان کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ بیمار روحوں اور محنتی جسموں والے" تنہا' لوگوں کا گروہ تھا۔

دوسرا گروہ بڑے بڑے مکانوں میں رہنے والوں کا تھا۔ یہ گزری ہوئی عمروں والے تجربہ کار' ذمہ دار افسر تھے جو اس سارے منظر کو کنٹرول کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ نچلے طبقے میں سے ابھرے تھے' کچھ اونچے طبقے میں سے' بعض کو موجودہ پوزیشن تک پہنچنے کے لئے سخت محنت کرنا پڑی تھی' بعض آسانی سے اوپر آ گئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ سب وجیہہ شخصیتوں اور آسان روحوں والے لوگ تھے۔ ان کے گھر مضبوط' زندگیاں محفوظ اور چہرے مطمئن تھے۔ ان [illegible] پن تھا۔ یہ [illegible] کے ساتھ کام کرتے تھے اور اپنی روزانہ کی غذا' اپنے بچوں اور گھر کے سامنے والے باغ میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ وہ عمر کی اس منزل میں تھے جب معمولی صلاحیتوں کے انسان کی زندگی میں جمود اور قناعت آ جاتی ہے۔ وہ کئی نسلیں کے بعد کے اس ہندوستان میں رہ رہے تھے جب اوچھی عمر اور بڑھے ہندوستانی افسروں کے لئے طلب سے اطمینان بخش خیال یہ تھا کہ زندگی میں انہوں نے ایک باعزت مقام حاصل کر لیا ہے اور عہدے میں اپنے کئی ساتھیوں سے زیادہ ترقی حاصل کی ہے اور ان کے بچے انگریزی سکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ وہ غیر دلچسپ اور ایک حد تک خودغرض لوگ تھے جو اونچی غیر ملکی سوسائٹی میں' کبھی کبھار' احساس کمتری کے ہمراہ جا سکتے تھے' ماتحت طبقے کے چلے جلوسوں اور شادی بیاہوں میں شدید احساس برتری کے ساتھ شریک ہوتے تھے' برج کھیلتے تھے' ڈریس سوٹ پہنتے تھے اور اپنی صحت کا خیال رکھتے تھے۔

ایک درمیانہ اور سب سے زیادہ دلچسپ گروہ نوجوان افسروں کا تھا۔ ان میں زیادہ تر غیر شادی شدہ تھے اور نئے نئے درس گاہوں سے نکل کر آ رہے تھے۔ سب کے سب بیحد چست' مستعد اور صحت مند نوجوان تھے۔ ان میں اکثریت ایسے نوجوانوں کی تھی جو نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے' ایسے گھرانے جن کا کوئی پس منظر' کوئی روایات نہیں ہوتیں' جو فقط زندہ رہنے اور اپنے کنبوں کو پالنے کی جدوجہد ہی میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ ان نوجوانوں کی روحانی حالت خستہ تھی لیکن ان کے پاس چند خواب تھے جن کو پورا کرنے کی خاطر وہ ہمہ تن مصروف

رہتے تھے۔ ان میں سے چند ایک کو محکمہ صنعت کی طرف سے کچھ عرصہ کے لئے یورپ بھی بھیجا جا چکا تھا اور ان کے خیالات خاصے ترقی یافتہ تھے۔ یہ خوش لباس لوگ تھے اور ان کے کمروں میں صفائی کا عنصر نمایاں تھا۔ ہر ایک شے موزوں جگہ پر دھری تھی اور باقاعدہ صفائی کی وجہ سے چمک رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل اور کتابوں کی میز سب سے نمایاں جگہ پر تھیں جن پر کمرے میں داخل ہونے والے کی نظر سب سے پہلے پڑتی تھی۔ بستر اور میز کا لیمپ کم نمایاں جگہ پر‘ جوتے ایک کونے میں نصف پوشیدہ‘ جن کو روز کا آنے والا یا دیر تک بیٹھا رہنے والا دیکھ سکتا تھا۔ کپڑے کہیں نظر نہ آتے تھے‘ جو یا تو بستر کے نیچے ٹرنک میں بند تھے یا الماریوں اور غسل خانوں میں ٹنگے ہوئے تھے۔

کتابوں کے گرد پوش مضبوط اور خوش نما تھے اور ہر روز جھاڑ پونچھ کر رکھے جاتے تھے۔ انہیں بے حد ترتیب کے ساتھ سائز وار سجایا گیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کا قد آدم آئینہ اس زاویے پر موڑا گیا تھا کہ کتابوں کی قطاریں اس میں سے دکھائی دیں۔ کتابوں کی اندرونی حالت خستہ تھی کیونکہ انہیں پڑھنے کے لئے کوئی وقت نہ تھا‘ کوئی خواہش نہ تھی۔ بعض کتابوں کو اندر سے دیمک چاٹ چکی تھی اور وہ کھوکھلی اور [illegible] ہو گئی تھیں۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ان نوجوانوں اور ان کی کتابوں کے وجود میں ور دناک حد تک مشابہت تھی۔

یہ بات نہیں کہ ان کے پاس فالتو وقت نہ تھا۔ لیکن ان کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ماضی کے گھٹیا پن سے خوف زدہ تھے اور کسی صورت بھی اپنے آپ کو اس سے منسلک رکھنا نہ چاہتے تھے۔ عمر میں پہلی مرتبہ [illegible] جسمانی طمانیت میسر آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی تجسس اور اضطراب ختم ہو گیا تھا۔ ان کی روحیں آسان ہو رہی تھیں۔ زندگی کا راستہ سیدھا اور بے خطر تھا جس پر ان کو بڑھتے جانا تھا‘ بے سمجھ سرگرمی کے ساتھ۔ ان کے ’آئیڈیل‘ وہ افسر تھے جو ان سے فقط ایک درجہ اوپر تھے۔ ان کی نظر میں یہ وہ لوگ تھے جو اپنی پوزیشن کے اہل تھے اور زندگی میں کامیاب رہے تھے۔ ان کی تقلید میں یہ نوجوان ان کی عملی کامیابی‘ ان کا احساس کمتری و برتری‘ ان کا ازاری پن اور خود غرضی اور ان کی دانائی حاصل کر رہے تھے۔ یہ اپنے وجود کی اس سطح پر مکمل طور پر خوش تھے جہاں زندگی کے مشکل تر مراحل میں سے گزرے بغیر منزل تک پہنچا جا سکتا تھا۔ یہ خوش باش لوگ تھے۔

ان کی مجلسی زندگی میں یکسر تبدیلی آ چکی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر‘ جنہوں نے ابتدائی عمر میں یا درسگاہوں میں ادنیٰ عادات اور تربیت پائی تھی‘ اب تہذیب یافتہ ہوتے جا رہے تھے۔ تہذیب اور اخلاق کا ان کے پاس ایک بالکل نیا تصور تھا جو کہ ان کے لئے بے حد خوش کن تھا۔ ایک چھوٹے سے کلب میں وہ اکثر شاموں کو اکٹھے ہوتے‘ تاش کھیلتے اور گپیں مارا کرتے۔ وہاں پر وہ کبھی کسی ملکی‘ سیاسی یا معاشرتی مسئلے پر بہت زیادہ سنجیدگی یا جوش کے ساتھ بحث کرتے ہوئے نہ گئے تھے۔ ضبط و اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا یا غیر ضروری طور پر گرمجوشی کا اظہار کرنا ادنیٰ تربیت کو ظاہر کرتا تھا‘ چنانچہ سخت ناگوار تھا۔ وہ یہ کبھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ غیر تہذیب یافتہ کہلائیں‘ چاہے اس کی قیمت ان کو نفرتوں اور لمبی لمبی شخصی کدورتوں کی شکل میں ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ وہ

UrduPhoto.com

ایک بہتر زندگی میں داخل ہو رہے تھے جہاں خارجی زندگی بے فکر اور آسان تھی' راستہ بے خطر اور پُر آسائش تھا۔ لیکن شخصی زندگی میں قدم قدم پر دریچے اور دل شکن انکشافات تھے' ضبط اور کمزنفسی تھا۔ اس نے ان نوجوانوں کو مغرور اور زود رنج بنا دیا تھا۔ وہ ایک ایسے نئے چمکدار جوتے کی طرح تھے پہلے ہی روز کسی حادثے کی وجہ سے جس کے ٹانکے ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور پہننے والے کو ہمیشہ اسے احتیاط اور میانہ روی سے استعمال کرنا پڑتا ہے۔

ملک کے حالات یا عوامی جذبات سے کسی کو دلچسپی نہ تھی' کوئی خواہش نہ تھی۔ ان کا فالتو وقت زیادہ تر باتیں کرنے میں گزرتا۔ ہلکی' پُر اخلاق' خوش کن باتیں' افواہیں' پُر مذاق گپیں جن سے خود اطمینانی کا احساس پیدا ہوتا' لڑکیوں کی باتیں جو نہایت غیر شخصی اور ہلکے طنزیہ انداز میں کی جاتیں۔ ذاتی باتیں کوئی نہ کرتا اور ذاتیات میں دلچسپی کوئی نہ لیتا۔ اگر کوئی ذاتی مسئلہ پیش کرنا بھی چاہتا تو اس خیال سے رک جاتا کہ کہیں سننے والوں کی طبیعت پر بار نہ گزرے۔ ماحول میں ان کا ایک ہلکا پھلکا' بے تاثر وجود تھا' جیسے بجلی کے وہ کھمبے جن پر ابھی تار نہ لگائے گئے ہوں ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان اکا دکا چپکے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں عجیب اور بے جان!

عملی زندگی میں اور زیادہ تصادم تھا۔ کاریگروں اور مزدوروں کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ انھیں برتری حاصل تھی چنانچہ ان سے الگ تھلگ رہنا ضروری تھا۔ افسروں کی طرف سے ان کی بہت کم حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ کبھی کبھار بڑی دعوتوں میں گھروں پر مدعو کر لئے گئے اور بس ان کے لئے مسرور ترین دن وہ ہوتا جس روز وہ کسی افسر کے [illegible] کا موقع پا لیتے۔ اس طرح وہ ایک دردناک علیحدگی میں جا پڑے تھے۔ لیکن یہ علیحدگی ان کے لئے اذیت ناک نہ تھی بلکہ ان کی خود پسند اور زود رنج طبع کی خوراک بن گئی تھی۔ آپس میں بھی ان کے تعلقات بڑے دلچسپ تھے۔ جن کو وہ اپنے سے زیادہ قابل اور ہوشیار سمجھتے ان کے ساتھ دوستی کرنے سے کتراتے اور حاسدانہ احترام کے ساتھ ان سے ملتے۔ زیادہ تر ان سے بے تکلف ہوتے جن کو اپنے سے کمتر' بے ضرر اور بیوقوف سمجھتے۔ ایک بے روح مادی زندگی کے قواعد نے انھیں عورتوں سے زیادہ حاسد بنا دیا تھا۔ یوں ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ ان کا برتاؤ بے حد پُر اخلاق تھا۔

تیز سفید دھوپ تھی جس سے آنکھیں دکھنے لگتی ہیں اور زمین بے رنگ اور کمزور ہو جاتی ہے اور کوے پانی کے نلوں پر بیٹھے رہتے ہیں' بیٹھے رہتے ہیں حتیٰ کہ لوگ ان کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور موسم کی شدت میں پرندے اور انسان کے قدرتی عناد کا احساس نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ یہ مئی کا موسم تھا' ننگے بے رنگ کھیتوں کا موسم۔

طویل میدان کو پار کر کے علی تو تعمیر کمرے میں داخل ہوا۔ کڑی دھوپ میں سے گزر کر آنے کے بعد خنک دیواریں اور تازہ پلستر کی بو اسے خوشگوار معلوم ہوئی۔ اس نے لمبا پُر سکون سانس لیا اور ہوا کی نمی کو حلق میں محسوس کیا۔ کمرے کے وسط میں کھڑے کھڑے اس نے خوشی اور سکون کے ساتھ بے مدعا چاروں طرف دیکھا۔ اس کے معدے کی جلن اب کم ہو گئی تھی اور وہ آسانی کے ساتھ اپنے وزن کو سنبھالے ہوئے کھڑا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر

UrduPhoto.com

نرم روشنی تھی جو آنکھوں کو اچھی لگتی تھی۔ فرش پر جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی اینٹیں' گھلا ہوا پلستر' لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے پڑے تھے۔ دو ایک جگہ ترکھانوں کے اوزار اور لکڑی کا سامان بکھرا تھا۔ کمرے میں سوائے علی اور ایک دوسرے شخص کے' جو کونے میں بیٹھا کھا رہا تھا' اور کوئی نہ تھا۔ اس نے کمرہ پار کر کے اوزار فرش پر رکھے اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی۔ لُو اور دھوپ کے سیلاب کے ساتھ کھڑکی کے راستے باہر کا سارا منظر کمرے میں آ گیا۔ طویل اور چٹیل میدان' اور اسے تیز تیز پار کرتے ہوئے اکا دُکا مزدور اور کاریگر جن کے سروں اور کندھوں پر سورج چمک رہا تھا۔ پرے فیکٹری کی عمارت جس کے برآمدوں میں بیٹھے وہ کھانا کھا رہے تھے اور پسینہ پونچھ رہے تھے۔ سارا کام ایک دم تھم گیا تھا۔ یہ کھانے کا اور خاموشی کا وقفہ تھا۔

''اسے بند کر دو۔'' دوسرے شخص نے بے تعلق لیکن قطعی لہجے میں کہا۔

علی نے کھڑکی بند کر دی۔ باہر کا نظارہ واپس چلا گیا۔ وہ ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ڈھانپ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ بند آنکھوں کے سناٹے میں دیکھتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے اس نے اپنے آپ کو محفوظ اور آسودہ محسوس کیا۔ پھر اس نے ہاتھ ہٹائے اور آنکھیں جھپکنے لگا۔

وہ اس کی طرف آدھی پشت موڑ کر بیٹھا ہوا کالی سے کھا رہا تھا۔ پشت سیاہ اور چوڑی تھی اور گوشت کی کمی کے باعث کندھوں کی مضبوط ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کا جبڑا بہت لمبا اور بھاری تھا اور وہ کالی کرتے ہوئے بیل کی طرح چل رہا تھا۔ علی خاموشی سے بیٹھا اس غیر انسانی جبڑے کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے دیکھتے ہوئے علی کو قوت کا احساس ہوا۔ سخت خوراک ٹوٹ کر' پس کر' ذرات میں تبدیل ہو کر لعاب بن کر گلے سے اتر رہی تھی اور جبڑا کالی سے' لیکن مشین کی باقاعدگی اور قوت کے ساتھ چل رہا تھا۔

کھانا ختم کر کے وہ مڑا۔ ''لو.....'' اس نے بچی ہوئی روٹی علی کی طرف بڑھائی۔

''مجھے بھوک نہیں۔'' علی نے کہا۔ وہ تعجب سے ہنسا اور روٹی کا ٹکڑا کتے کے آگے پھینک دیا۔

''آدمی کا حلق پہلے ہے۔ خیر.....'' وہ کھانے کی پوٹلی باندھتا ہوا بولا۔

''کیوں؟'' علی نے پوچھا۔

اس نے سر اٹھایا اور ایک سادہ' احمقانہ ہنسی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ علی نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا لیکن اس کا بے تکلف ہمدردی کا رویہ اس کے جی کو اچھا لگا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ پوٹلی کے ساتھ ہونٹ صاف کر رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا مضبوط چہرے اور سادہ آنکھوں والا شخص تھا۔ اس کے سیاہ پٹھے دار جسم سے مشقت کی آفتوں کا اظہار ہوتا تھا۔ علی دیوار سے ٹیک لگا کر کمرے میں دیکھنے لگا۔ وہ دل میں سُن محسوس کر رہا تھا اور خوش تھا۔

''میں ہر روز نئے بنتے ہوئے کمروں میں آ جاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیوں؟''

''گرمی سے بچنے کے لئے۔''

UrduPhoto.com

"آہ.... آہاہا" ادھیڑ عمر شخص کے ہونٹوں سے مختصر اور بے اختیار ابلتی ہوئی ہنسی نکلی۔ "عجیب بات ہے۔ عجب۔"

علی اس کو دیکھتا رہا۔

"آہاہا......" وہ پھر ہنسا۔ "جب کمرے بننے بند ہو جائیں گے پھر؟"

"پھر؟" علی سوچنے لگا۔ "پھر تو جاڑے آ جائیں گے۔"

اس کے منہ سے پھر وہی مختصر' ابلتی ہوئی ہنسی پیدا ہوئی۔ ایسی ہنسی پکی عمر کے جاہل محنت کش لوگوں کے لئے غیر معمولی بات تھی۔

"یہ اچھے دل کا آدمی ہے۔" علی نے سوچا۔

"بڑی عجیب بات ہے۔ بڑی عجب" اس نے دہرایا۔

"کیا؟"

"اس پلے کو میں روز روٹی دیتا ہوں۔ پر ایک روز میں چلا جاؤں گا تو پھر؟"

"کہاں؟"

"گھر۔"

"گھر؟" علی نے حیرانگی سے دہرایا۔ پھر اس نے دیوار کے ساتھ سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں اور زیر لب بڑبڑایا۔ "[illegible]"

پلا آ کر اس کا پاؤں چاٹنے لگا تھا۔ اس نے آنکھیں بند رکھیں اور یاد کیا کہ اس دفعہ فصل کے موقع پر اس کو چھٹی نہ ملی تھی اور گھر پر کوئی مرد نہ تھا اور اسے اطلاع ملی تھی کہ کاٹنے والوں نے اس کی ماں کو بہت کم حصہ دیا تھا۔ اس کے معدے میں پھر ہلچل اٹھی۔

UrduPhoto.com

ادھیڑ عمر کا شخص غور سے اس نوجوان آدمی کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑے ہوئے تھے اور رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں مگر جس کے چہرے پر ابھی تک نوجوانی کا بانکپن تھا۔ اس نے آہستہ سے علی کو کندھے پر چھوا۔

"تم بیمار ہو؟"

"میں؟ نہیں۔" علی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"میں نے بہت سے کسانوں کو بیمار دیکھا ہے' آج کل۔"

"میں کسان نہیں ہوں۔" علی نے کہا۔

"کسان بیمار نہیں ہوتا۔ اسے بیماری راس نہیں آتی۔ جب وہ بیمار ہوتا ہے تو مر جاتا ہے۔ پر پتا نہیں۔"

اس نے فکرمندی سے ہاتھ پھیلائے۔ "اتنی زیادہ مردنی...... شکل سے تو تم کسان ہی دکھائی دیتے ہو۔"

"میں مستری ہوں۔"